رموزِ بیخودی — تبصرہ

پروفیسر اے۔ جے۔ آربری
ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

مستقبل کا مؤرخ جب ہمارے دور کے اہم واقعات کا جائزہ لے گا تو بلاشبہ ان میں دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد تقریباً دس کروڑ افراد کی ایک ایسی قوم کے اچانک اور حیران کن ظہور کو انتہائی اہم واقعہ قرار دے گا جس کی قومیت کا دعویٰ مذہب کی بنیاد پر تھا اور افراد کی بہت بری اکثریت اسی مذہب سے وابستہ تھی۔ ہم ابھی ظہورِ پاکستان کے اتنے قریب ہیں کہ پوری طرح ہندوستان کے مسئلے کے اس ڈرامائی حل کی اہمیت سمجھنے سے قاصر ہیں، جس نے ہمارے آباء واجداد کے ذہنوں کو پریشان کیے رکھا تھا۔ تاہم اخباروں کا سرسری مطالعہ کرنے والا قاری بھی اب قیامِ پاکستان اور دنیا کی سیاست کے اہم رجحانات پر اس کے اثرات کو کسی قدر سمجھنے لگا ہوگا۔ اقوامِ متحدہ کے مباحثوں میں پاکستانی مندوب نے اس قدر توجہ اور عزت حاصل کی ہے کہ خواہ وہ مسئلہ کشمیر کی بات ہو یا مراکش اور تیونس کے احساسات کی ترجمانی، بین الاقوامی سیاسی منظر کا کوئی انتہائی کند ذہن مبصر ہی ہوگا جو اب بھی محسوس نہ کرتا ہو کہ یہ نیا ملک دنیا کی تاریخ کے آئندہ ڈرامے میں ایک نہایت اہم کردار ادا کرنے کا تہیہ کر چکا ہے۔

جب مستقبل کا مؤرخ ان اسباب کا تجزیہ کرے گا جو ظہورِ پاکستان کا سبب بنے تو وہ لازماً ایک ایسی شخصیت کی تحریروں کو بھی مدِنظر رکھے گا جو بعض لوگوں کے بقول اس عظیم مملکت کی خالق اور بعض لوگوں کے بقول خالقوں میں سے ایک تھی —— سر محمد اقبال (۱۹۳۸ء تا ۱۸۷۷ء) جسے ولفرڈ اینٹول سمتھ نے اپنی اہم کتاب ہندوستان میں جدید اسلام میں اس صدی کا ممتاز مسلمان شاعر اور مفکر قرار دیا ہے اور جس کی عظمت کا پیمانہ اسے حاصل ہونے والی بین الاقوامی توجہ اور عزت قرار دیا گیا ہے۔ ہندوستانی صوبوں کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے اُنھوں نے ایک خواب دیکھا تھا مگر اس کی خلاف توقع فوری تعبیر سے پہلے ہی وہ وفات پا گئے۔ ان کی زندگی کے آخری چند سال ذہنی اور جسمانی کرب میں بسر ہوئے مگر انھیں یہ سکونِ

قلب نصیب نہ ہو سکا کہ جس مقصد کے لیے میں نے اس قدر جدوجہد کی ہے، وہ حاصل ہونے ہی والا ہے۔لیکن آزادیِ پاکستان کے ساتھ ہی مطبوعات کی ایک لہر آئی جس میں انھیں دنیا کی اس متمول ترین اور سب سے زیادہ آباد مسلم مملکت کے روحانی بانی کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔اس سند کو آج بھی اسی قدر اہمیت دی جاتی ہے۔

اقبال شاعر ہونے کے علاوہ ایک فلسفی بھی تھے۔اُنھوں نے اپنا فلسفہ نثر کی بجائے شاعری میں پیش کرنے کو ترجیح دی ہے۔شاید یہی سبب ہے کہ وہ مغرب میں مقابلتاً کم مشہور ہیں اور ان کے بارے میں غلط فہمیاں بھی پائی جاتی ہیں۔نثری تحریریں زیادہ تر انگریزی میں ہیں جب کہ شاعری اُردو اور فارسی میں ہے جو اُن زبانوں کے ادبیات کی روایتی تصویروں سے بھری پڑی ہے۔جب اس کا انگریزی میں ترجمہ کیا جاتا ہے تو لامحالہ یہ کس قدر دور از کار اور اجنبی معلوم ہونے لگتی ہے۔علاوہ ازیں اقبال کا اسلوب با محاورہ ہے اور کم ہی اتفاق ہوتا ہے کہ ان کی فکر پیچیدہ نہ ہو۔ان کا اظہار اپنی زبان کی نوعیت کے اعتبار سے بے حد نازک ہوتا ہے۔جب کہ ان کے ہاں شعری متصورہ کی بہتات اُس قاری کو بوکھلا دیتی ہے جو اس کی فوری تبدیلیوں اور خطابیہ تنوع کی سطح کے نیچے پائی جانے والی فکری ہم آہنگی سے آگاہ نہیں ہوتا۔میرے علم میں ایسا کوئی اور مشرقی شاعر نہیں ہے جو مترجم کے لیے ایسی مختلف النوع اور کڑی مشکلات پیدا کر دیتا ہے۔

اقبال کی عظمت پہلی مرتبہ اسرار خودی کی اشاعت سے آشکار ہوئی۔یہ فارسی میں فلسفیانہ حماسہ ہے جس کا ترجمہ آنجہانی آر۔اے۔نکلسن نے سیکرٹس آف دی سیلف کے عنوان سے کیا ہے (میکملن: ۱۹۲۰ء)۔اس نظم میں اُنھوں نے معاشرے میں فرد کی حیثیت کے بارے میں اپنے نظریات کا پہلا حصہ بیان کیا ہے۔اُنھوں نے نکلسن کو لکھا تھا: ''زمین پر خدا کی حکمرانی کا مطلب ہے کم و بیش منفرد اشخاص کی جمہوریت جس کی امارت دنیا کے ممکنہ حد تک سب سے زیادہ منفرد شخص کے پاس ہو۔خودی یا انفرادیت اسرارِ خودی کا بنیادی نظریہ ہے۔انسان کا اخلاقی اور مذہبی نظریہ نفیِ خودی نہیں، اثباتِ خودی ہے۔اور یہ نظریہ زیادہ سے زیادہ منفرد اور زیادہ سے زیادہ یکتا ہو کر حاصل کیا جا سکتا ہے۔'' اقبال کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ کسی حقیقی اسلامی معاشرے ہی میں ممکن ہے کہ فرد مکمل طور پر اثباتِ ذات کے حصول میں کامیاب ہو سکے۔

ان کے نظریے کا دوسرا حصہ رموزِ بیخودی میں بیان ہوا ہے جس کا ترجمہ میں مسٹریز آف سیلف لیس نس کے عنوان سے کیا ہے۔ظاہر ہے کہ اقبال کا نظریۂ خودی اگر معاشرے سے الگ تھلگ رہ کر ارتقا پذیر ہو تو وہ غیر معتدل انائیت اور نراجیت پر منتج ہوتا ہے۔تاہم وہ محض فرد اور اس کے انکشافِ ذات تک اپنی دلچسپیوں کو محدود نہیں رکھتے بلکہ وہ ایک نظریاتی معاشرے کے قیام کے بھی خواہش

مند ہیں، جسے وہ ملت کے لفظ سے یاد کرنا پسند کرتے ہیں۔فرد ایک معاشرے کے رکن کی حیثیت سے تصادم اور ہم آہنگی کے توام اُصول کے ذریعے اپنے آپ کو بھرپور طریقے سے ظاہر کرسکتا ہے۔ اثباتِ ذات کرنے والے افراد ہی کے ذریعے ملت وجود میں آئی ہے اور تکمیل پاتی ہے۔ اسی طرح اقبال فرد کی آزادیوں پر پابندی لگا کر اسے مادر پدر آزاد آزادی سے بچاتے ہیں اور اسے ایک ہم آہنگ معاشرے کا فرد بناتے ہیں۔ اسی طرح معاشرے کے اختیارات کو کم کر کے فرد کی خودشناسی کے راستے میں اسے نا قابلِ تسخیر رکاوٹ کی بجائے چیلنج بنا کر اسے آمریت سے محفوظ رکھتے ہیں۔

ان دونوں نظموں میں مختصراً اور سادہ لفظوں میں یہی بنیادی خیالات پیش کیے گئے ہیں۔ خیالات تو اتنے نئے نہیں ہیں، نہ ہی یہ دعویٰ نیا ہے کہ اسلام یک آدرشی معاشرہ ہے، تاہم نئی بات یہ ہے کہ اقبال نے فرد اور معاشرے کے اس نظریے کا اطلاق اسلام پر کیا ہے اور اسے اس حیثیت سے دنیا کے تمام مذہبوں اور نظاموں سے برتر قرار دیا ہے۔ اسلامی اتحاد کے لیے موجودہ زمانے میں پروپیگنڈا جمال الدین افغانی (۹۷-۱۸۳۸ء) کے دور سے اب تک مسلسل جاری ہے۔ اقبال اسی نقطۂ نظر کا جدید ترین بلکہ قابل ترین اور موثر ترین وکیل تھا۔ اس نے ایک ایسی تحریک کے لیے، جو عقلی سے زیادہ جذباتی ہے، ایک عقلی بنیاد مہیا کی۔

رموزِ بیخودی میں اقبال نے بین الاقوامی اسلام کا مقدمہ پیش کیا ہے۔ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی، اقبال ایسی خلافت کے احیا کے بارے میں شدت سے سوچ رہے تھے جو دنیا بھر کے تیس کروڑ مسلمانوں کو ہی مذہبی ریاست کے ماتحت لے آئے۔ مگر اسی زمانے میں مملکتِ عثمانیہ کے خاتمے اور خلافت کے مٹنے اور ترکی کے لادین قرار دیے جانے اور متعدد خودمختار یا نیم آزاد عرب ریاستوں کے قیام نے انھیں واقعات میں رجائیت کا رنگ بھرنے سے اجتناب پر آمادہ کیا۔ اُنھوں نے تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ (۱۹۳۴ء) میں لکھا ہے:

> ہر مسلمان مملکت کو موجودہ حالات میں اپنی ذات کے باطن میں غوطہ زن ہونا چاہیے۔ عارضی طور پر اپنے نقطۂ نظر کو اپنی ذات پر مرکوز کر لینا چاہیے، حتیٰ کہ یہ مملکتیں اتنی مضبوط ہو جائیں کہ زندہ جمہوریتوں کا ایک کنبہ وجود میں لاسکیں۔ قومی مفکرین کے خیال میں ایک سچا اور زندہ اتحاد محض علامتی سربراہ کے ذریعے وجود میں لانا آسان کام نہیں ہے۔ اس کا حقیقی وجود آزاد اور خودمختار اکائیوں کو ضرب دینے اور ان کے نسلی امتیازات کو ہم آہنگ کرنے اور انھیں ایک مشترکہ احساساتی پابندی میں مدغم کرنے سے حاصل ہوسکتا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ خدا ہمیں رفتہ رفتہ اس صداقت کا احساس دلا رہا ہے کہ اسلام نہ قومیت ہے اور نہ سامراج بلکہ ایک انجمنِ اقوام ہے جو مصنوعی سرحدوں اور نسلی امتیازات کو محض حوالے میں آسانی کے لیے تسلیم کرتی ہے، لیکن

اپنے اراکین کے معاشرتی افق کو محدود نہیں کرتی۔''

اسی ذہنی کیفیت کے ماتحت اقبال نے مسلمانوں کی ہندوستان سے علیحدگی اور پاکستان کے قیام کا پُرزور مطالبہ کیا۔ اگرچہ بہشتِ ارضی کی تاریخ ملتوی کر دی گئی لیکن اس عرصے میں اہم کام کرنا ابھی باقی تھا۔

۲۶ جنوری ۱۹۵۲ء کو قاہرہ کے ہفتۂ سیاہ کے واقعات نے بہت سے لوگوں کو، جو ابھی تک اسلام اور مغرب کے تصادم کو غیر اہم سمجھتے تھے، یہ باور کرا دیا ہے کہ ایسی صورتِ حال میں موجود ہے جو انتہائی خطرناک ہے۔ تعجب ہے کہ اس کو اتنی آسانی سے نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ خطرے کی گھنٹیاں بہت دیر سے بج رہی ہیں۔ جب اقبال نے لکھا تھا ''یقین کیجیے یورپ اس وقت انسان کی اخلاقی ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے'' تو وہ کوئی ایسی بات نہیں کہہ رہے تھے جو اُنھوں نے اس سے قبل نہیں کہی تھی۔ اور وہ ایسا محض اکسانے یا صدمہ پہنچانے کے لیے بھی نہیں کہہ رہے تھے، نہ ہی وہ ویرانے میں ابھرنے والی تنہا آواز تھے۔ دنیا کے امن اور تحفظ کے راستے میں موجودہ خطرات یقیناً اتنے ہی کم نہیں ہیں۔ ان خطرات میں سے کوئی خطرہ صلیبی جنگوں کی فضا کے موجودہ احیا سے بڑھ کر نہیں۔

پیچیدہ مسائل کو انتہائی سادہ بنا کر پیش کرنا شاید بیسویں صدی کا بے حد پریشان کن گناہ ہے۔ وہ دنیا جو تعلیم بالغاں کو مقبولِ عام ذرائعِ ابلاغ کی مدد سے رائج کر رہی ہے اور سنجیدہ ادب سے اجتناب کرتی ہے، اخبارات کی سرخیوں کی اس قدر عادی ہو چکی ہے کہ ذہنی طور پر کسی دیانت دارانہ اور بنا بریں حجاب آمیز تجزیے کو قبول نہیں کر سکتی۔ فلسفی ہونے کی وجہ سے اقبال موجودہ دنیا کے رواج کے مطابق بلند آہنگی کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ وہ لکھتے ہیں ''یورپ کی عینیت پسندی کبھی ایک زندہ حقیقت نہیں بن سکی۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہاں معکوس انانیت کی شکار اور ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے والی جمہوریتیں وجود میں آئی ہیں جن کا واحد مقصد دولت مندوں کے مفادات کے لیے غریبوں کا استحصال کرنا ہے۔'' اس قسم کے خیالات واضح کرتے رہے ہیں کہ کمیونسٹوں کو کیوں اس بات میں دقت پیش نہیں آتی کہ وہ اقبال کو اپنا ساتھی قرار دے دیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مشرقی اور مغربی سیاست دانوں کو اس بات کی بڑی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ دنیا کو دو رنگوں یعنی سیاہ و سفید میں پیش کریں۔ لیکن جب ایک سیاست دان اپنے آپ کو پیغمبر کے طور پر پیش کرے اور پیغمبر مانا جائے تو اس کے لیے موزوں نہیں ہے کہ وہ بچگانہ انداز سے صابن کے بکس کے کھیل میں اُلجھا رہے، جب تک کہ وہ ہٹلر کی طرح تخیلاتی تاخت و تاراج کرنے کا خواہش مند نہ ہو۔

موجودہ زمانے میں یورپ کے متعلق مشرق کی نفرت میرے خیال میں ہمعصر سیاست کا سب سے زیادہ خوفناک اور پریشان کن پہلو ہے اور اسے محض شکست خوردہ سامراجیت کے خلاف فاتحانہ ردِعمل کہہ کر

نظرانداز نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا سبب یہ بھی ہے لیکن اصل اسباب زیادہ گہرے ہیں۔ اس کو محض ان کمتر درجے کے ذہنوں کے صدماتی ردِعمل سے منسوب نہیں کیا جا سکتا جو اس صدی کے دوسرے اور تیسرے عشرے میں دنیا بھر میں یہ کہتے پھرتے تھے کہ یورپی تہذیب جلد ہی ختم ہونے والی ہے۔ اور وہ اس گھونسلے کو تباہ کرنا چاہتے تھے جس سے وہ اپنے خیال میں آگے نکل چکے تھے۔ اگرچہ جو بیج اُنھوں نے بے خیالی میں بوئے تھے وہ زبردست فصل لے آئے ہیں۔ اس کا سبب جنگِ عظیم اور اس کے نتیجے میں ہونے والی قتل و غارت بھی نہیں ہے، تاہم ذاتی اصلاح کی ایک کوشش کا ذریعہ بن سکتا ہے۔ یہ تمام عناصر موجود ہیں اور متحرک ہیں۔ لیکن اس سبب کے نیچے وہ چیلنج پنہاں ہے جو تیرہ صدیاں پہلے صحرائے عرب سے دیا گیا تھا اور جسے بار بار اقبال اس کے پیش روؤں اور پیروکاروں نے بیان کیا ہے۔ اسلام خصوصی طور پر خدا کا آخری پیغام ہونے کا دعوے دار ہے اور تمام مذاہب کو ختم کرنے کا مدعی ہے۔

یورپ صدیوں تک اسلام کے ساتھ بایں معنی بے انصافی کرتا رہا ہے کہ اس کے مثبت اضافوں کو نظر انداز کیا جاتا تھا۔ سبب یہ ہے کہ علمیت مذہبی فرقہ واریت کی لونڈی رہی ہے۔ اس بے انصافی کے خلاف امیر علی اور اس کے دبستان نے بجا طور پر احتجاج کیا تھا۔ اور چونکہ اس قسم کا مجادلہ یورپ کا منتخب ہتھیار رہا ہے اس لیے یورپ کے پاس شکایت کا کوئی جواز نہیں ہے اگر اسلام نے اس ہتھیار کو اُسی فنکاری سے یورپ ہی کے خلاف استعمال کیا ہے۔ گزشتہ صدی کی اعتدال پسند تحریک نے اسلام کی عالمی خدمات کا زیادہ حقیقت پسندانہ طریقے سے اعتراف کیا ہے۔ یورپ کے علما نے، جبکہ امیر علی ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، کریمانہ لیکن ضرورت سے زیادہ سادہ انداز اختیار کرتے ہوئے ریاضی، ادویات، سائنس، فنون، ادبیات، قانون، فلسفہ اور سیاسیات میں اسلامی ترقیات کا بہ مسرت اعتراف کر لیا تھا۔ اس انداز کے ورثوں سے خوشہ چینی کا تذکرہ فیشن بن گیا اور دورِ وسطیٰ کے اسلامی ورثے سے یورپ کے استفادے کا بھرپور اعتراف کیا جانے لگا۔ اپنے ماضی کے متعلق زیادہ یقین اور اعتماد سے غیر متعصب عالموں کے ان علمی سندات کو ذوق و شوق سے پیش کرتے ہوئے مسلم معترضین نے یہ الزام لگانا شروع کر دیا کہ موجودہ یورپی تہذیب میں جو کچھ اچھا ہے وہ تو اسلام کی وجہ سے ہے اور جو برائیاں ہیں وہ دوسری قوتوں کے سبب سے ہیں۔ ایک ہندوستانی مصنف ایف۔ کے۔ درانی نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ ''علم، تہذیب اور تمدن میں ساتویں صدی سے موجودہ صدی تک ساری ترقیات براہِ راست یا بالواسطہ بانیِ اسلام کے ذہن سے استفادہ کر کے وجود میں آئی ہیں۔'' اقبال قدرے کم جذباتی کیفیت میں لکھتے ہیں: ''یقین کیجیے انسان کے اخلاقی ارتقا کے راستے میں اس وقت سب سے بڑی رکاوٹ یورپ ہے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے قبضے میں وہ امر حقائق ہیں جن کی بنیاد وحی پر ہے۔ یہ حقائق اس کی خارجی ہیئت کو زندگی کی گہرائیوں کے حوالے سے داخلیت میں بدل

دیتے ہیں۔ ہمارے روحانی حقائق جزوِ ایمان ہیں جن کے لیے ہمارا سب سے کم آ گاہ آدمی بھی جان قربان کرسکتا ہے۔ اسلام کے اس بنیادی عقیدے کے بعد کہ اس کے بعد کوئی شریعت نہیں آ سکتی، ہم روحانی طور پر دنیا کے سب سے زیادہ وسیع المشرب لوگ ہیں۔ آج مسلمانوں کو اپنی اس صورتِ حال کا جائزہ لینا چاہیے، اپنی زندگی کو امر اُصولوں کے مطابق ڈھالنا چاہیے اور اسلام کے جزوی طور پر حاصل کردہ مقصد کی مدد سے ایسی روحانی جمہوریت وجود میں لانی چاہیے جو اسلام کا آخری مقصد ہے۔'' یقیناً بات اُلٹ گئی ہے۔ عیسائی یورپ کو، جو ایشیا میں اپنی خود ساختہ تہذیب سکھانے کے مقصد کے دعوے دار تھا، اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ خود سے نئے سرے سے مشرقی تہذیب کی مدد سے مہذب بننے کی ضرورت ہے۔

یہ تمام باتیں کتنی پریشان کن ہیں۔ لندن، پیرس یا نیویارک میں کسی آرام کرسی پر بیٹھ کر اس تمام مناقشے کو لفظی جنگ قرار دے دینا آسان ہے لیکن موجودہ اسلامی دنیا سے گزرنے والا کوئی سیاح بھی فوراً اس کی تصدیق کرے گا کہ یہ خطرناک استخراج نتائج ہوگا۔ قاہرہ کے ہفتۂ سیاہ کی آگ اور خون سے قطع نظر، جسے اگر کچھ لوگ چاہیں تو برطانوی سامراجیت کے خلاف ردِ عمل قرار دے سکتے ہیں یا کمیونسٹوں کے ہنگامہ کرانے کی کوشش کہہ سکتے ہیں یا مشرقی ہجوم کی روایتی لاقانونیت کا مظاہرہ قرار دے سکتے ہیں، دنیا کے اس وسیع علاقے میں بھی، جو مراکش سے انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے، اگر بیدار مغزی سے دیکھا جائے تو ممکن نہیں کہ اس بات کا غیر اطمینان بخش ادارک نہ ہو کہ اسلام اور یورپ ایک دوسرے کے خلاف تلے کھڑے ہیں اور جنگ یا امن کے درمیان انتخاب زیادہ دور نہیں ہے۔ خواہ ہم اس پسند کریں یا نہ کریں، خواہ ہم ایشیائی ہوں یا یورپی یا افریقی، ہم ایک پُر از خطر دور میں زندگی گزار رہے ہیں اور صلاح الدین ایوبی اور رچرڈ کی جنگوں کے بعد سے اب تک ایک شدید ترین تصادم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کیا ہم یہ قیاس کرنے میں حق بجانب ہیں کہ حقائق اس سے مختلف ہیں؟ اگر ہم اس خوفناک اور غیر ضروری تصادم سے بچنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ ہم ایک دوسرے کا نقطۂ نظر سمجھنے کی از سرِ نو اور ان تھک کوشش کریں اور دیکھیں کہ کیا امکانات ہیں: اوّل کشیدگی کو کم کرنے کے اور اس کے بعد ایک عقلی تعاون کے۔ اور بالآخر ایک مشترکہ مقصد کی طرف ایک ساتھ بڑھنے لگیں۔ رموزِ بیخودی کا ترجمہ کرتے وقت میں نے مسلمانوں کے مقدمے کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے جسے پُر زور طریقے سے ایک مفکر اور اہم شاعر نے پیش کیا ہے۔

جہاں تک میرا تعلق ہے، میں ایک عیسائی ہوں جسے اس بات سے کوئی دلچسپی نہیں کہ کوئی مسلمان میرے آبائی مذہب میں شامل ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ عیسائیت اور اسلام کے درمیان موجودہ بد آہنگی اگر بالکل ہم آہنگ نہیں ہوسکتی تب بھی اسے موجودہ جذباتی بحثوں کے منطقے سے نکال کر زیادہ خنک خطے میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ ان مباحثوں سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ دونوں مذاہب میں اتفاقات کا دائرہ

اختلافات سے وسیع تر ہے اوراس سے یہ توقع پیدا ہو جائے گی کہ اختلاف کسی دن تعاون میں بدل جائے گا۔ اور یہ بات اور بھی جلدی ہو سکتی ہے اگر عیسائی اور مسلمان واضح اور صاف طور پر جان لیں کہ ان کا سامنا ایک مشترکہ دشمن سے ہے جوان دونوں کو ختم کرنے کے درپے ہے جب تک دونوں مل کر اس کا مقابلہ نہ کریں۔

نکلسن نے اسرارِ خودی کے ترجمے کی بابت لکھا تھا کہ ''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ہر جگہ اس کے مفہوم کو درست سمجھا ہے یا درست طور پر منتقل کیا ہے۔'' اور میں نے اس کتاب کا ایک ایسا نسخہ بھی دیکھا ہے جس کے حاشیے پر اقبال کی اپنی اصلاحیں ہیں جو اس بات کی نمایاں شہادت فراہم کرتی ہیں کہ نکلسن جیسے عالم کو بھی اقبال کے اسلوب کے ابہامات کو واضح کرنے میں کسی قدر دقتیں پیش آئی ہوں گی۔ میں تو محض نکلسن کی رائے کو اپنی بابت دہرا سکتا ہوں، مگر اتنا اضافہ ضروری ہے کہ میرا ترجمہ اور زیادہ ناتسلی بخش ہوتا اگر خوش قسمتی سے پاکستان کے مشہور عالموں اور اقبال اکیڈمی کے اراکین نے، جو اقبال کے ذاتی دوست رہے ہیں، اس پر نظر ثانی نہ کی ہوتی۔ یہ حضرات مجھ سے کہیں زیادہ اقبال کے خیالات اور اسالیب کے سمجھنے والے ہیں۔ اس موقع پر ان کا شکریہ ادا کر کے مجھے مسرت حاصل ہوتی ہے۔ ترجمے کو بے قافیہ نظم میں ڈھالا گیا ہے—— اصل نظم مقفیٰ ابیات میں لکھی گئی ہے—— میں نے کوشش کی ہے کہ جہاں مفہوم سختی سے اصل کے قریب رہے وہیں فارسیت کی شعری خوشبو بھی کسی قدر منتقل ہو جائے۔

(ڈاکٹر سلیم اختر— اقبال ممدوح عالم)